ڈاکٹر فرید پربتی: یادوں کے آئینہ میں

تاریخ کیا تھی، مہینہ کون سا تھا مجھے یاد نہیں لیکن موسم سردی کا تھا اور شاید 2004 کا سن، دہلی یونیورسٹی میں اس دن چھٹّی تھی اس لیے میں گھر ہی میں تھا اور کسی کام میں مصروف کہ اچانک میرے لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی، جب میں نے فون کا رسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو ادھر سے تیزی سے آواز آئی ''السلام علیکم''.....، میں فرید پربتی بول رہا ہوں.....، کیا آپ عقیل صاحب ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں۔انہوں نے پھر پوچھا کہ ''مغیث الدین فریدی اور قطعات تاریخ'' کے مصنف آپ ہی ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں.....اس کے بعد انھوں نے اطلاع دی ''میں بھی سپراسن سیٹی میں ہوں۔میرے فلیٹ کا نمبر 344-B ہے، آپ سے ملاقات کب ہوسکتی ہے؟ آج ہی شام میں.....میں نے جواب دیا۔فرید پربتی نے فون پر جب یہ کہا کہ میں بھی سپراسن سیٹی میں رہتا ہوں تو ایک پل کے لیے لگا کہ یہ کوئی اور فرید پربتی ہوں گے لیکن جب انہوں نے پوچھا کہ ''مغیث الدین فریدی اور قطعات تاریخ'' آپ ہی کی کتاب ہے تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کوئی اور فرید پربتی نہیں ہیں بلکہ کشمیر والے ہی فرید پربتی ہیں کیوں کہ چند روز پہلے ''آج کل'' کے ایڈیٹر ابرار رحمانی نے فون پر کہا تھا کہ فرید پربتی ''آج کل'' کے آفس آئے تھے اور تمہاری کتاب ''مغیث الدین فریدی اور قطعات تاریخ'' مجھ سے مانگ کر لے گئے۔انہیں تمہاری کتاب بہت پسند آئی۔تم اس کتاب کی دوسری کاپی مجھے بھیج دو۔ابرار بھائی کی بات مجھے یاد آئی تو مجھے یقین ہوا یہ وہی فرید پربتی ہیں کوئی اور نہیں۔بہرحال فرید پربتی سے جلد سے جلد ملنے کا دل چاہنے لگا اور میں شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔مقررہ وقت سے پہلے ہی 344-B پہنچ گیا۔ڈوربیل بجاتے ہی سفید کرتہ اور پاجامہ میں ملبوس ایک شخص نے دروازہ کھولا جو پربت جیسا لمبا چوڑا تھا۔اس کے چہرے پر کشمیری حسن، سنجیدگی، شرافت اور متانت کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔کوئی بھی شخص انہیں دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ یہی فرید پربتی ہیں۔انہوں نے سلام کرتے ہوئے اندر آنے کے لیے کہا۔ان کے Body language کو دیکھ کر لگا کہ وہ بھی کافی دیر سے میرے انتظار میں تھے۔اندر جانے کے بعد انہوں نے اپنی اہلیہ سے میرا تعارف کرایا اور ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بجائے بیڈروم میں ہی بٹھایا۔ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ ابھی ابھی یہاں رہنے کے لیے آئے ہیں اور چند دنوں تک ہی یہاں قیام کریں گے۔بات چیت کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ سردیوں کی چھٹیوں میں یہاں رہ کر پڑھائی کریں گے کیوں کہ سری نگر میں اتنی سردی پڑتی ہے کہ پڑھنے لکھنے کا کام دشوار ہوجاتا ہے۔فرید پربتی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔اس سے پہلے نہ کبھی میں ان سے ملا تھا اور نہ ٹھیک سے انہیں جانتا تھا لیکن اس مختصر سی ملاقات میں ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ مجھے لگا کہ جیسے برسوں سے شناسائی ہو۔انہوں نے بھی اس طرح میری خاطر تواضع کی جیسے کوئی برسوں سے بچھڑے ہوئے دوست کے اچانک مل جانے کے بعد کرتا ہے۔میں ان کے گھر تھوڑی دیر کے لیے گیا ہوا تھا لیکن انہوں نے تاریخ گوئی کی روایت اور فن پر ایسی گفتگو شروع کی کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب رات ہوگئی اور پھر کھانے کی تیاری ہونے لگی لیکن مجھے احساس ہوا کہ میری بیوی بھی کھانے کے لیے میرے انتظار میں ہیں اس لیے ان سے معذرت کرتے ہوئے پھر آنے کا وعدہ کیا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔وہ جتنے دنوں تک شپراسن سیٹی میں رہے ان سے ملاقات ہوتی رہی اور رفتہ رفتہ ان کے حالاتِ زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کمالات سے بھی واقف ہوتا گیا۔

فرید پربتی واپس کشمیر چلے گئے لیکن ان سے رابطہ برقرار رہا۔ان کی جب بھی کوئی تحریر یا شعری تخلیق شائع ہوتی تو میں انہیں مبارک باد دیتا اور اپنی رائے بھی دیتا۔اسی طرح میرا بھی کوئی مضمون شائع ہوتا تو وہ مجھے فون کرتے اور مبارک باد دیتے۔2005 میں ان کا شعری مجموعہ ''گفتگو چاند سے'' شائع ہوا جس کی ایک کاپی مجھے 13 اکتوبر 2005 کو ملی۔میں نے فرید پربتی کو فون کر کے مبارکباد دی اور کہا کہ کتاب پڑھنے کے بعد رائے دوں گا۔کتاب زیر مطالعہ تھی ۔ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر ریاض احمد (جو مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں لکچرر ہیں) کا فون آیا۔کہنے لگے بہت بہت مبارک ہو،اب تو آپ کے نام سے کتاب انتساب کیا جارہا ہے۔ان کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی اور میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ فرید پربتی نے اپنی کتاب ''گفتگو چاند سے'' کا انتساب آپ کے نام کیا ہے۔مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا کیوں کہ یہ کتاب دس دنوں سے میرے زیر مطالعہ تھی اور اس کے متعلق فرید پربتی سے میری بات چیت بھی ہو چکی تھی لیکن نہ انہوں نے کتاب کے انتساب کے متعلق مجھ سے کچھ کہا تھا اور نہ انتساب والا صفحہ میری نظر سے گذرا تھا۔لیکن جب میں نے کتاب کے ابتدائی صفحات پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب پانچ حضرات کے نام معنون کی گئی ہے جن میں ایک نام میرا بھی تھا۔اپنا نام دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔حیرت اس لیے کہ کتاب کا انتساب عام طور پر والدین، اساتذہ، بیوی بچوں یا فیملی ممبرس کے نام کیا جاتا ہے یا پھر کسی ایسے شخص کے نام جو کسی بڑے عہدے پر فائز ہو اور مصنف کو فائدہ پہنچانے کے لائق ہو۔میں ان میں سے کسی بھی زمرے میں نہیں آتا تھا۔میں نے فرید پربتی کو فون کر کے جب یہ بات بتائی تو وہ کہنے لگے کہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ ان میں سے کسی بھی کٹیگری میں نہیں آتے ہیں؟ آپ تو میرے بھائی بھی ہیں اور دوست بھی۔ان کی باتیں سن کر میں لاجواب ہو گیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔میں سوچتا رہا کہ فرید پربتی نہ صرف ایک اچھے شاعر و ادیب ہیں بلکہ ایک با اخلاق انسان اور سچے دوست بھی ہیں۔میری نظر میں ان کا قد اور اونچا ہو گیا تھا اور میں روحانی لذتوں سے محظوظ ہونے لگا کیوں کہ ابن سینا نے کہا ہے کہ جس طرح مادی لذتوں کے کئی درجات ہیں اسی طرح روحانی لذت کے بھی کئی مدارج ہیں جن میں پہلی کا تعلق بہترین یادوں سے، دوسری کا مخلص احباب و اقارب کی قربت سے اور تیسری کا علم سے ہے۔

16 نومبر کی شام میں پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کا فون آیا اور انہوں نے فرید پربتی کے ایک دوست کے حوالے سے یہ خبر دی کہ فرید پربتی بہت بیمار ہیں اور غالباً انہیں کینسر ہو گیا ہے تو میں حیران و پریشان رہ گیا کیوں چند روز پہلے ہی ان سے تفصیل سے بات ہوئی تھی ۔میں نے اسی وقت ان کے موبائل پر متعدد بار فون لگایا لیکن فون کسی نے نہیں اٹھایا۔اس کے بعد میں نے اپنے ایک کشمیری دوست فیاض دلبر جو میرے گھر کے سامنے ہی رہتے ہیں فون کر کے فرید پربتی کی بیماری کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے کہا۔انہوں نے فوراً کشمیر میں فرید پربتی کے دوستوں کو فون کر کے صرف اتنا معلوم کیا کہ ان کے پیٹ کا آپریشن دہلی کے All India Institute of Medical Science میں ہوا ہے لیکن تفصیل کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔کئی دنوں تک میں فرید پربتی کے موبائل پر فون کرتا رہا اور آخر کار ایک ہفتہ کے بعد ان کی اہلیہ نے فون اٹھایا اور انہوں نے ان کی بیماری کی پوری تفصیل بتائی۔میں 25 نومبر کو تقریباً 3 بجے شام ان سے ملنے کے لیے All India Institute of Medical Science کے پرائیوٹ وارڈ کے روم نمبر 209 میں گیا۔اس وقت وہ لیٹے ہوئے تھے لیکن میرے جاتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ان کی حالت دیکھ کر میں Shocked ہو گیا۔وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید نظر آرہے تھے۔انہیں سلام کرنے کے بعد کچھ دیر تک میں بالکل خاموش رہا۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔کمرے میں ان کی اہلیہ اور ایک شخص موجود تھے جو غالباً کشمیر سے ان کی مدد کے لیے آئے ہوئے تھے۔ان کے سر کے پاس بائیں طرف ایک سائڈ ٹیبل پر رسالہ 'آج کل' اور صلاح الدین پرویز (مرحوم) کی نئی کتاب ''بنامِ غالب'' رکھی ہوئی تھی۔فرید پربتی نے ہی بات کی شروعات کی اور بتایا کہ کافی دنوں سے اکثر ان کے پیٹ میں درد ہوتا تھا لیکن انہون نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن درد میں جب اضافہ ہونے لگا تو سری نگر کے کسی ڈاکٹر سے دکھایا۔ڈاکٹر نے جب ان کا انڈواسکوپک کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے پیٹ میں السر ہو گیا ہے جو خطرناک حالت میں ہے۔اس کے بعد وہ دہلی آئے اور 15 اکتوبر کو ان کے پیٹ کا آپریشن ہوا۔ڈاکٹر کے مطابق آپریشن کامیاب رہا لیکن Infection کی وجہ سے مسلسل بخار رہتا تھا۔انہیں امید تھی کہ وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور گھر واپس چلے جائیں گے۔اس دن میں وہاں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک تھا اور ان سے اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ زیادہ تر ادبی گفتگو ہوتی رہی۔لیکن اس دن وہ مایوس نظر آرہے تھے۔بات چیت کے دوران انہوں نے بتایا کہ اب وہ طرز زندگی بدل لیں گے اور صوفیوں کی طرح گوشہ نشینی

اختیار کرلیں گے۔صلاح الدین پرویز کی موت کی خبر سن کر وہ بے حد رنجیدہ تھے اور ان کی کتاب ''بنام غالب'' ان کے زیر مطالعہ تھی۔انہوں نے وہ کتاب مجھے دی اور کہا کہ اسے گھر لے جایئے اور آرام سے پڑھیئے۔ان سے ملاقات کے بعد گھر چلا یا آیا مجھے پوری امید تھی کہ ٹھیک ہو جائیں گے۔لیکن افسوس کہ وہ میری آخری ملاقات تھی۔وہاں سے آنے کے بعد تقریباً ہر روز میں ان کی اہلیہ کو فون کر کے ان کی خیریت پوچھتا تھا اور وہ بتاتی تھیں کہ ابھی بہتر ہیں لیکن ہفتہ دس روز کے بعد انہوں نے بتایا کہ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔دو تین دنوں کے بعد جب میں نے پھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ انہیں سری نگر لے جایا گیا ہے۔یہ سنتے ہی مجھے بے حد خوشی ہوئی اور یہ سمجھ کر کہ وہ ٹھیک ہو گئے ہیں دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا لیکن دوسرے ہی پل جب ان کی اہلیہ نے یہ بتایا کہ ان کی حالت بہتر نہیں تھی اسی لیے ہم لوگ انہیں یہاں لے کر چلے آئے اور انہیں شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کر دیا تو پھر Shocked ہو کر رہ گیا اور اس کے بعد کچھ بول نہیں پایا۔میں نے فوراً ان کے ایک عزیز دوست ڈاکٹر محی الدین زور کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں آپ ان کے لیے دعائیں کرتے رہیئے۔

14 دسمبر 2011 کی وہ منحوس گھڑی میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا جب میں سپر اسن سیٹی کے جوگرس پارک میں شام کے وقت سیر کر رہا تھا کہ اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔موبائل کے Display Screen کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر محی الدین زور کا نام Display ہو رہا تھا۔موبائل کے Screen پر یہ نام دیکھتے ہی میں ڈر گیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا خبر دینے والے ہیں۔میرے قدم رکنے لگے،سردی کا احساس ہونے لگا اور گھبراہٹ میں میری قوت گویائی ساتھ نہیں دے رہی تھی پھر بھی اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے پوچھا،سب ٹھیک تو ہے نا۔انہوں نے کہا نہیں ٹھیک نہیں ہے بہت بری خبر ہے۔ابھی ابھی ڈاکٹر فرید پربتی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔یہ خبر سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی،آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔مجھے احساس ہوا کہ میرا مخلص دوست،بڑا بھائی،ایک نیک انسان اور اس عہد کے ایک اچھے شاعر و ادیب نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو کرتے ہوئے ڈاکٹر ابرار رحمانی،حقانی القاسمی اور ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کو یہ منحوس خبر دی۔یہ خبر سنتے ہی تینوں حضرات سکتے میں آ گئے اور ٹھیک سے اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ابرار بھائی تو یہ خبر سنتے ہی زاوقطار رونے لگے ان کی اہلیہ گھبرا گئیں اور فوراً ان سے فون لیکر کہنے لگیں کہ آپ کون صاحب ہیں؟ کس کو کیا ہوا؟.....دس منٹ کے بعد جموں سے ڈاکٹر ریاض احمد کا اور بھوساول،مہاراسٹر سے احمد کلیم فیض پوری نے بھی فون کر کے یہ خبر دی اور اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔رفتہ رفتہ آگ کی طرح یہ خبر ہندوستان کے تمام ادبی حلقوں میں پھیل گئی اور چاروں طرف ماتم جیسا ماحول پیدا ہو گیا۔

مجھے ابھی بھی یقین نہیں ہو رہا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ابھی چند روز پہلے ہی کی بات ہے کہ انہوں نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ وہ ایک رسالہ نکالنے جا رہے ہیں۔اس کے لیے آپ اپنے اور شکیل الرحمٰن صاحب کے کچھ مضامین بھیج دیجئے۔انہوں نے شموئل احمد،انجم عثمانی اور مشرف عالم ذوقی سے رابطہ قائم کر کے ان کے افسانے بھجوانے کے لیے بھی کہا تھا۔میں نے اپنے اور شکیل الرحمٰن صاحب کے مضامین اور شموئل احمد کے افسانے بھیج دیے تھے لیکن انجم عثمانی اور مشرف عالم ذوقی سے ابھی بات کرنا باقی تھا کہ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔فرید پربتی میرے بہت اچھے دوست اور بھائی تھے۔وہ ہر موضوع پر دل کھول کر بات کرتے تھے ہر دکھ سکھ میں مجھے شریک رکھتے تھے اور مشورے بھی کرتے تھے۔وہ جب بھی دہلی آتے تھے تو مجھ سے ضرور ملتے تھے اور اکثر ساتھ کھانا کھاتے تھے لیکن یہاں بھی وہ ہمیشہ خود کو میزبان تصور کرتے تھے مجھے مہمان۔وہ مجھے ہمیشہ کشمیر آنے کی دعوت دیتے تھے اور میں وہاں آنے کا وعدہ کرتا تھا اور اپنی بیوی سے مل کر جانے کا پروگرام بھی بناتا تھا لیکن وقت اور حالات نے وہاں جانے کی اجازت نہیں دی۔4 اور 5 فروری 2011 کو میں نے اپنے کالج میں ''اردو تنقید کا جدید منظر نامہ'' کے موضوع پر ایک نیشنل سمینار منعقد کیا تھا جس میں انہوں نے بھی ''اسلوبیاتی تنقید کی روایت'' پر اپنا مقالہ پڑھا تھا۔اس وقت سمینار کے کاموں میں بے حد مصروف ہونے کی وجہ سے انہیں زیادہ وقت نہیں دے پایا تھا اور ہماری ملاقات ادھوری رہ گئی تھی لیکن 29 اور 30 مئی 2011 کو جموں یونیورسٹی میں فیض سمینار کے موقع پر ان سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ہم دونوں یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔وہ گراؤنڈ فلور پر ڈاکٹر محی الدین زور کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اور میں ڈاکٹر انور پاشا کے ساتھ 3rd

فلور پر تھا لیکن میرا سارا وقت فرید پربتی کے ساتھ ان کے کمرے میں خوشگوار موڈ میں گذرا۔ وہ مجھے سری نگر لے جانے کے لیے بضد تھے لیکن دوسرے دن مجھے واپس آنا تھا اس لیے ان کے ساتھ نہیں جا سکا۔ اس کا مجھے بے حد ملال ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کچھ دنوں کے مہمان ہیں تو میں ان کی بات ضرور مان لیتا۔ مستقبل میں اگر مجھے کشمیر جانے کا موقع ملا بھی تو ان کے بغیر کشمیر کے حسین مناظر سے لطف اندوز نہیں ہو پاؤں گا کیوں کہ ان کی یادوں سے مجھے فرصت نہیں ملے گی۔

فرید پربتی سے وابستہ یادیں بحرِ بے کراں کی مانند موجزن ہیں اور ان کی زندگی کے کئی پہلو کسی کہانی کی طرح میری نظروں کے سامنے گھومتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ان کے متعلق بس لکھتا ہی رہوں۔ کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ فرید پربتی کا اصلی نام غلام نبی بھٹ تھا۔ ان کے والد محترم کا نام خواجہ حبیب اللہ بھٹ تھا اور والدہ کا نام مصرہ خانم ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ شمیمہ جنہیں وہ 'شمی' کہتے تھے کشمیر حکومت کے ایک مڈل اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہیں۔ وہ بھی انہیں ہی کی طرح با اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ فرید پربتی کی پیدائش 4 اگست 1961 عیسوی میں سنگین دروازہ (حول) سری نگر میں ہوئی تھی۔ انہوں نے M.Com کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں M.A کیا۔ 1992 عیسوی میں ''خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری'' کے موضوع پر M.Phil اور 1995 میں شاہ حاتم دہلوی، حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے 1987 سے 2001 تک کشمیر اکاؤنٹس سروس میں ملازمت کی۔ اس کے بعد وہ 2001 سے 2006 تک شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے اور 2006 سے تا حال اقبال انسٹی ٹیوٹ کلچر اینڈ فلاسفی (کشمیر یونیورسٹی) میں اسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے فائز رہے۔

فرید پربتی اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ انہوں نے مشہور شاعر علی احمد جلیلی ابن فصاحت جنگ جلیلی مانک پوری، جانشیں امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'ابرتر' 1987 میں شائع ہوا تھا جس غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں۔ دوسرا شعری مجموعہ 'آبِ نسیاں' 1992 میں شائع ہوئی تھی اس میں بھی غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں۔ تیسرا مجموعہ 'اثبات' 1997 میں شائع ہوئی اس میں بھی غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ چوتھا مجموعہ 'فرید نامہ' 2003 میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں صرف رباعیاں ہیں۔ پانچواں مجموعہ 'گفتگو چاند سے' 2005 میں شائع ہوئی اس میں ان کی غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ چھٹا مجموعہ 'ہزار امکاں' 2006 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں۔ ساتواں مجموعۂ کلام 'خبرِ تحیر' 2007 میں شائع ہوئی اس میں صرف رباعیاں شامل ہیں۔ آٹھواں مجموعہ 'ہجوم آئینہ' 2010 میں شائع ہوئی تھی اس میں بھی غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ 'ہزار امکاں' کے عنوان سے ان کی شاعری کی کلیات 2011 میں شائع ہوئی۔ ان کی تنقیدی کتابوں میں 'شہ زور کشمیری (تلمذ سیماب اکبر آبادی) حیات وفن' 1992 میں، 'انتقاد و اصلاح' 2005 میں، 'صنف رباعی' 2006 میں، 'داغ بحیثیت مثنوی نگار' 2010 اور 'تنقید رباعی' 2011 میں شائع ہوئیں۔ ان کی آخری کتاب ''شہ زور کشمیری (تلمذ سیماب اکبر آبادی) حیات وفن'' ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہوئی لیکن جب یہ کتاب شائع ہو کر آئی اس وقت فرید پربتی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ فرید پربتی کو کلاسیکی ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ رباعی کی شعریات پر ان کی کتاب 'تنقید رباعی' بہت اہم ہے۔

''شاعر'' ممبئی میں 2005 اور 2011 میں فرید بربتی کے اعتراف میں گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جناب سلیم سالک نے 2006 میں ''فرید پربتی: شعر شعور شعریات'' اور ڈاکٹر مشتاق حیدر اور شاہ فیصل نے 2011 میں ''فرید پربتی: تنقید، تخلیق اور تفکر'' کے عنوانات سے ایک ایک کتاب مرتب کی تھی۔ یوں تو فرید پربتی تنقید و تحقیق میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک فطری شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے کئی (Dimensions) پہلو ہیں لیکن ان کی شاعری میں صوفیانہ افکار قاری کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتی ہیں۔

فرید پربتی کی کتاب ''گفتگو چاند سے'' کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں چاند، ستارے اور روشنی سے بے حد محبت ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے چاند اور ستاروں کا استعمال اپنے اشعار میں کثرت سے کیا ہے اور اپنے مجموعۂ کلام کا نام بھی ''گفتگو چاند سے'' رکھا ہے۔ فلسفیوں کے مطابق چاند اور ستاروں میں جو روشنی ہوتی ہے اسے نورِ عارضی یا نورِ حادث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نور کی دو قسمیں ہوتی ہیں نورِ مجرد (یعنی روح) اور نورِ عارضی

یا نور حادث۔ نورِ مجرد کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ نورِ مجرد سے نور کی مختلف نیم شعوری، شعوری اور بالذات صورتیں ابھرتی ہیں۔ شعور یا علمِ ذات، نورِ مجرد کا جوہر ہے۔ جبکہ نورِ عارضی کی کوئی نہ کوئی صورت ہوتی ہے جو اپنے علاوہ بھی کسی چیز کی صفت بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے چاند اور ستاروں کا نور۔ اس نور کو نورِ محسوس بھی کہا جاتا ہے جو دراصل نورِ مجرد ہی کا عکسِ بعید ہے۔ کائنات دراصل بے پناہ تجلّیوں کی شعاعوں کا ایک سایہ ہے۔ ان تجلّیوں کی وجہ سے کائنات کی اشیا مستقل حرکت میں رہتی ہیں اور ان میں ایک عشق کا جذبہ نمو پاتا رہتا ہے تاکہ وہ حقیقی سرچشمۂ نور سے مستفیض ہوتی رہیں۔ عشق، نورِ مجرد (روح) اور جسم کے درمیان ذریعۂ اتحاد کے طور پر کام کرتا رہتا ہے۔ جو جسم تجلّی کا خواہش مند ہوتا ہے وہ روح کے وسیلے سے اسے حاصل کرتا ہے کیوں کہ روح، جسم اور سرچشمۂ نور کے درمیان براہ راست تعلق قائم کر دیتی ہے لیکن روح اس نور کو جو یہ براہ راست حاصل کرتی ہے تاریک اور ٹھوس جسم میں منتقل نہیں کر سکتی کیوں جسم اپنی صفت کے اعتبار سے ہستی کی ایک مخالف سمت میں واقع ہے۔ ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت ہے۔ یہ واسطہ ایک ایسی چیز ہے جو نور اور ظلمت (یا جسم) کے درمیان واقع ہے۔ یہ واسطہ روح حیوانی ہے۔ یہ ایک گرم، لطیف اور شفاف بخار ہے جس کا مخصوص مقام قلب کی بائیں جانب ہے۔ لیکن یہ پورے جسم میں گردش بھی کرتا ہے۔ چونکہ روح حیوانی اور نور میں ایک جزوی مماثلت بھی ہے اس لیے تاریک راتوں میں بحری جانور آگ کی روشنی کی طرف لپکتے ہیں اور سمندری جانور پانی سے نکل کر چاندنی رات کے دلنشیں مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر خشکی پر نکل آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے بلند ترین مراتب طے کرنا اور زیادہ سے زیادہ تجلی حاصل کرنا انسان کا نصب العین ہے اور اس طرح سے وہ بتدریج عالم صور سے مکمل نجات پالیتا ہے۔ فرید پربتی کا چاند، ستاروں اور ان کی روشنی سے غیر معمولی محبت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے قلب کی بائیں جانب جو روح حیوانی موجود تھی وہ بے حد بیدار تھی شاید اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ تجلی حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ اسی خواہش نے انہیں عالمِ صوری سے بہت جلد نجات دلا کر عالم لاہوت میں پہنچا دیا جہاں وہ فنا فی اللہ ہو گئے۔ اب وہ نور اوّل یعنی نورِ قاہرہ کا حصہ بن چکے ہیں اور کائنات میں پھیل چکے ہیں، چاند اور تاروں کی روشنی میں بھی ان کا نور موجود ہے۔ ان کی اہلیہ، عزیز و اقارب اور دوست احباب ان کے نور کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں محسوس کر سکتے ہیں۔

متذکرہ کتاب (یعنی گفتگو چاند سے) کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں چاند کا استعمال بطور استعارہ و علامت کیا ہے:

دل کی وسعت کے لیے چاند ستارے کم ہیں
اکتفا کس پہ کروں میری طلب پوچھتی ہے

چہرہ پردے سے جو اُس رشکِ قمر کا نکلا
ہر کوئی کہنے لگا چاند کدھر کا نکلا

جانے کس سوچ میں بیٹھی ہے ستاروں کی قطار
چاندنی دیر سے کہتی ہے سراپا ہو جاؤں

بھاتا ہے مجھ کو چاند نظارا سرِ فلک
ہر پھر کے آرہا ہوں دوبارا سرِ فلک

نکلا تھا گھر سے ڈھونڈنے میں اپنے آپ کو
آیا نظر نہ کوئی ستارا سرِ فلک

دل و جگر میں اُترتی ہے کہکشاں کی قطار
یہ چاند رات کہاں اب گزارنے جاؤں

کسی جھولی میں یہ تارے ہی نہیں گرنے کے
یہ طلب گار کا اندازِ نظر جانتے ہیں

پرانی روشنیوں کو بجھائے دیتا ہوں
نئے ستارے زمیں پر مَیں لائے دیتا ہوں
رونق دنیا ہے باقی میں ہی لیکن بجھ گیا
چاند ہے بھرپور تارے میں چمک باقی نہیں
رونق دنیا ہے باقی میں ہی لیکن بجھ گیا
چاند ہے بھرپور تارے میں چمک باقی نہیں

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad